دردآشوب

احمد فراز

۱۹۶۶ء کا آدم جی، ادبی انعام یافتہ

دردِ آشوب

احمد فراز

پبلشر : محمد یوسف

ناشر : یوسف پبلشرز۔ بنک روڈ۔ راولپنڈی۔ صدر

طباعت : ٹی۔ ایس۔ پرنٹرز، گوالمنڈی

قیمت : 25 روپے

کتابت : محمد صدیق منظر تلمیذ یوسف نگینہ

محبوب اختر کے نام

ملنے کا پتہ

یوسف پبلشرز
بینک روڈ۔ راولپنڈی

ترتیب

فنکاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دُنیا کے خوابوں کی جنّت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے اِنسان کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عُمر بھر خوں اگلتے رہے

جنگ کی آگ دُنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سُناتے رہے

جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے
اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیئے
تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیئے
تم مرے تو زمانے کے ہاتھوں سے مرے
تم جئے تو زمانے کی خاطر جئے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدّعی
تم نے دنیا سے دنیا کی باتیں کہیں،

تم نے ذرّوں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

کاخ و دربار سے کوچۂ دار تک
کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ! یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبّت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لئے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دُنیا ہی نبھانے کے لئے آ

کس کس کو بتائیں گے جُدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

اک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لئے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لئے آ

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دِل وُہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دِل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لُٹ بھی چکے
اور محبّت وُہی انداز پُرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تُو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دِل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز
مِل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

معبود

بہت حسین ہیں تیری عقیدتوں کے گلاب
حسین تر ہے مگر ہر گلِ خیال ترا
ہم ایک درد کے رشتے میں منسلک دونوں
تجھے عزیز مرا فن، مجھے جمال ترا

مگر مجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم جہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے اذیت ہے، زندگی بھر کی
یہاں گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
یہاں قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں.
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

○

جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

تو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسّس بیکار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی کہ وہ تو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی
لوگ مجھ کو ہی سُناتے ہیں فسانے میرے

لُٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گرِ دل یہ بھی خزانے میرے

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

ق

کاش تو بھی مری آواز کہیں سُنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

کاش تو بھی کبھی آ جائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے

کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری آج خدا نے میرے

تُو ہے کس حال میں اے زود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

چارہ گر یُوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فرازؔ
جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

نہ حریفِ جاں نہ شریکِ غم شبِ انتظار کوئی تو ہو
کسے بزمِ شوق میں لائیں ہم دلِ بے قرار کوئی تو ہو

کسے زندگی ہے عزیز اب کسے آرزوئے شبِ طرب
مگر اے نگارِ وفا طلب ترا اعتبار کوئی تو ہو

کہیں تارِ دامنِ گل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشان فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو

یہ اُداس اُداس سے بام و در یہ اُجاڑ اُجاڑ سی رہگذر
چلو ہم نہیں نہ سہی مگر سرِ کوئے یار کوئی تو ہو

یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے تو چراغِ دل ہی نہ بجھ چلے
وُہ بلا سے ہو غمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو

سرِ مقتلِ شبِ آرزُو رہے کچھ تو عشق کی آبرُو
جو نہیں عدو تو فراز تو کہ نصیبِ دار کوئی تو ہو

شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند
کب سے شاخِ نہالِ غم پر
لرز رہا ہُوں
مجھے ابھی تک ہے یاد وُہ جاں فگار ساعت
کہ جب بہاروں کی آخری شام
مجھ سے کچھ یُوں لپٹ کے روئی
کہ جیسے اب عُمر بھر نہ دیکھے گا
ہم میں ایک دُوسرے کو کوئی

وہ رات کتنی کڑی تھی
جب آندھیوں کے شبِ خوں سے
بوٹے گل بھی لہو لہو تھی

سحر ہوئی جب تو پیڑ یوں خشک و زرد رُو تھے
کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہوئے رفیقوں کی
زخم خوردہ برہنہ لاشیں
گڑی ہوئی ہوں
میں جانتا تھا
کہ جب یہ بوجھل بلند اشجار
جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیوں میں برسوں سے جاگزیں تھیں
ہجومِ صرصر میں چند لمحے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو
میں ایک برگِ خزاں بھی
شاخِ نہالِ غم پر نہ رہ سکوں گا

وہ ایک پل تھا کہ ایک رُت تھی
مگر مرے واسطے بہت تھی
مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اوّلیں صبح
پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو
زندگی کی نئی قبائیں عطا کرے گی
مگر مرا دل دھڑک رہا ہے
مجھے، جسے آندھیوں کی یورش
خزاں کے طوفاں نہ چھو سکے تھے
کہیں نسیمِ بہار — شاخِ نہالِ غم سے
جُدا نہ کر دے

خود کلامی

دیکھے ہی نہیں وُہ لب و رُخسار وُہ گیسو
بس ایک کھنکتی ہُوئی آواز کا جادُو
حیران پریشاں لیے پھرتا ہے بہر سُو
پابندِ تصوّر نہیں وُہ جلوۂ بے تاب
ہو دُور تو جگنو ہے قریب آئے تو خوشبو
لہرائے تو شعلہ ہے چھنک جائے تو گھنگرو
باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر
وُہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کُوکُو
جیسے کوئی قُمری سرِ شمشاد لبِ جُو

اے دِل تری باتوں میں کہاں تک کوئی جائے

جذبات کی دُنیا میں کہاں سوچ کے پہلو
کب آئے ہیں فتراک میں وحشت زدہ آہو

مانا کہ وُہ لب ہوں گے شفق رنگ و شرر خو
شاید کہ وُہ عارض ہوں گُلِ تر سے بھی خوشرو
دِل کش ہی سہی حلقۂ زلف و خمِ ابرو

یہ کس کو خبر کس کا مقدّر ہے یہ سب کچھ

خوابوں کی گھٹا دُور برس جائے گی اور تو
لَوٹ آئے گا لے کر فقط آہیں فقط آنسو

دِل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اُڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اٹھا لے جائے

اور سے اور ہوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب اُبھرے تری یاد کا ڈُوبا ہُوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اُڑا لے جائے

یہی آوارگیٔ دِل ہے تو منزِل معلوم
جو بھی آئے تری باتوں میں لگا لے جائے

دشتِ غربت میں تمھیں کون پُکارے گا فرازؔ
چل پڑو خود ہی جدھر دِل کی صدا لے جائے

○

نہ انتظار کی لذّت نہ آرزو کی تھکن
بجھی ہیں درد کی شمعیں کہ سو گیا ہے بدن

سلگ رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے آنکھیں
نہ آنسوؤں کی طلب ہے، نہ رتجگوں کی جلن

دلِ فریب زدہ! دعوتِ نظر پہ نہ جا
یہ آج کے قد و گیسو ہیں کل کے دار و رسن

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سمن

بہارِ قرب سے پہلے اُجاڑ دیتی ہیں
جُدائیوں کی ہوائیں محبّتوں کے چمن

وُہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصالِ یار کی لذّت سے ٹوٹتا ہے بدن

پھر آج شب ترے قدموں کی چاپ کے ہمراہ
سُنائی دی ہے دلِ نامراد کی دھڑکن

یہ ظلم دیکھ کہ تو جانِ شاعری ہے مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جرمِ سخن

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنامِ وطن

ہوائے دہر سے دل کا چراغ کیا بجھتا
مگر فرازؔ سلامت ہے، یار کا دامن

○

ہم تو یُوں خوش تھے کہ اِک تار گریباں میں ہے
کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے

ایک ضرب اور بھی اے زندگیٔ تیشہ بدست
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے

مَیں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تُو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں!
مَیں ترے شہر سے دُور اور تو مرے دھیان میں ہے

سرِ دیوار فروزاں ہے ابھی ایک چراغ
اے نسیمِ سحری! کچھ ترے امکان میں ہے

دِل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گاہے گاہے
جیسے اب بھی تری آواز مرے کان میں ہے

خلقتِ شہر کے ہر ظلم کے باوصف فراز
ہائے وُہ ہاتھ کہ اپنے ہی گریبان میں ہے

○

خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دُعا کیوں نہیں دیتے

وحشت کا سبب رُزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و مہ و انجم کو بجُھا کیوں نہیں دیتے

اک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو! درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

منصف ہو اگر تم تو کب اِنصاف کرو گے
مُجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

کیا بیت گئی اب کے فراز اہلِ چمن پر؟
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

اِظہار

پتھر کی طرح اگر میں چُپ ہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانۂ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یُوں نہ دیکھ مجھُ کو
اے سنگ تراش! تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اوّلیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ ترے لیۓ دبی ہے
وُہ آگ ہی میری زندگی ہے

خودکشی

وُہ پیماں بھی ٹُوٹے جن کو
ہم سمجھے تھے پایندہ

وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو
برسوں رکھا تابندہ

دونوں وفا کرکے ناخوش ہیں
دونوں کیے پر شرمندہ

پیار سے پیارا جیون پیارے
کیا ماضی کیا آئندہ

ہم دونوں اپنے قاتل ہیں
ہم دونوں اب تک زندہ

سُن بھی اے نغمہ سنجِ کنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کسے
کون سا پیرہن سلامت ہے دیجیے دعوتِ بہار کسے

جل بجھیں دردِ ہجر کی شمعیں گھُل چکے نیم سوختہ پیکر
سر میں سودائے خام ہو بھی تو کیا طاقت و تابِ انتظار کسے

نقدِ جاں بھی تو نذر کر آئے اور ہم مفلسوں کے پاس تھا کیا
کون ہے اہلِ دل میں اتنا غنی اس قدر پاسِ طبعِ یار کسے

کاہشِ ذوقِ جستجو معلوم داغ ہے دل چراغ ہیں آنکھیں
ماتمِ شہرِ آرزو دیکھیے فرصتِ نغمۂ قرار کسے

کون دارائے ملکِ عشق ہُوا کس کو جاگیر چشم و زُلف ملی
خونِ فرہاد، برسرِ فرہاد" قصرِ شیریں پہ اختیار کسے

حاصلِ مشربِ مسیحائی سنگِ تحقیر و مرگِ رُسوائی
قامتِ یار ہو کہ رفعتِ داراں صلیبوں کا اعتبار کسے

○

دِل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی
اَب تو ہم لوگ گئے دیدۂ بے خواب سے بھی

رو پڑا ہُوں تو کوئی بات ہی ایسی ہو گی
ہیں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

کچھ تو اس آنکھ کا شیوہ ہے خفا ہو جانا
اور کچھ بھُول ہُوئی ہے دِلِ بے تاب سے بھی

اے سمندر کی ہوا تیرا کرم بھی معلوم
پیاس ساحل کی تو بجھتی نہیں سیلاب سے بھی

کچھ تو اس حسن کو جانے ہے زمانہ سارا
اور کچھ بات چلی ہے مرے احباب سے بھی

دل کبھی غم کے سمندر کا شناور تھا فرازؔ
اب تو خوف آتا ہے اک موجۂ پایاب سے بھی

○

وفا کے باب میں الزامِ عاشقی نہ لیا
کہ تیری بات کی اور تیرا نام بھی نہ لیا

خوشا وہ لوگ کہ محرومِ التفات رہے
ترے کرم کو بہ اندازِ سادگی نہ لیا

تمہارے بعد کئی ہاتھ دِل کی سمت بڑھے
ہزار شکر گریباں کو ہم نے سی نہ لیا

تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے
کسی نے سنگ اُٹھایا کسی نے مینا لیا

فرازؔ ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شعبدہ گر
تو کہ الفاظ سے اصنام گری کرتا ہے
کبھی اس حسن دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہو بھرتا ہے

بارہا دل نے یہ آواز سنی اور چاہا
مان لوں مجھ سے جو وجدان مرا کہتا ہے
لیکن اس عجز سے ہارا مرے فن کا جادو
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

زیرِ لب

کِس بُوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اِتنا تو کڑا سفر نہیں تھا
دو چار قدم کا فاصلہ کیا
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ
یہ حال تو عُمر بھر نہیں تھا

آغازِ سفر میں جب چلے تھے
کب ہم نے کوئی دیا جلایا

کب عہدِ وفا کی بات کی تھی
کب ہم نے کوئی فریب کھایا
وُہ شام وُہ چاندنی وُہ خوشبو
منزل کا کسے خیال آیا

تو محوِ سخن تھی مجھ سے لیکن
میں سوچ کے جال بُن رہا تھا
میرے لئے زندگی تڑپ تھی
تیرے لئے غم بھی قہقہا تھا
اب تجھ سے بچھڑ کے سوچتا ہوں
کچھ تو نے کہا تھا! کیا کہا تھا

○

ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

کتنے ناداں ہیں ترے بھولنے والے کہ تجھے
یاد کرنے کے لئے عمر پڑی ہو جیسے

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے

منزلیں دُور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

آج دل کھول کے روئے ہیں تو یُوں خوش ہیں فراز
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے

کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دِل کو لہُو کرے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دُکھ نہیں
پر دِل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تُو کرے

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

اب تو یہ آرزُو ہے کہ وُہ زخم کھائیے
تا زندگی یہ دِل کوئی آرزُو کرے

تجھ کو بُھلا کے دِل ہے وُہ شرمندۂ نظر
اَب کوئی حادثہ ہی ترے رُوبرُو کرے

چُپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فرازؔ
دُنیا تو عرضِ حال سے بے آبرُو کرے

○

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زخم کاری لگے

اُداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

علاج اس دلِ درد آشنا کا کیا کیجے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگساری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

فرازؔ تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وُہ صُورت سبھی کو پیاری لگے

ہمدرد

اے دِل ان آنکھوں پر نہ جا
جن میں وفورِ رنج سے
کچھ دیر کو تیرے لئے
آنسو اگر لہرا گئے

یہ چند لمحوں کی چمک
جو تجھ کو پاگل کر گئی!
اِن جگنوؤں کے نور سے
چمکی ہے کب وہ زندگی

جس کے مقدّر میں رہی
صبحِ طلب سے تیرگی

کس سوچ میں گُم سُم ہے تو
اے بے خبر! ناداں نہ بن
تیری فسُردہ رُوح کو
چاہت کے کانٹوں کی طلب
اور اس کے دامن میں فقط
ہمدردیوں کے پھُول ہیں

خواب

وُہ چاند جو میرا ہمسفر تھا
دُوری کے اُجاڑ جنگلوں میں
اب میری نظر سے چھُپ چُکا ہے

اک عمر سے میں ملول و تنہا
ظلمات کی راہگزار میں ہوں

میں آگے بڑھوں کہ لوٹ جاؤں
کیا سوچ کے ... انتظار میں ہوں
کوئی بھی نہیں جو یہ بتائے
میں کون ہوں کس دیار میں ہوں

سو دُوریوں پہ بھی مرے دِل سے جُدا نہ تھی
تو میری زندگی تھی مگر بے وفا نہ تھی

دِل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا
ورنہ وُہ آنکھ اتنی زیادہ خفا نہ تھی

یُوں دِل لرز اُٹھا ہے کسی کو پکار کر
میری صدا بھی جیسے کہ میری صدا نہ تھی

برگِ خزاں جو شاخ سے ٹوٹا وُہ خاک تھا
اس جاں سُپردگی کے تو قابل ہوا نہ تھی

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اُٹھی
اس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی

مرہونِ آسماں جو رہے اُن کو دیکھ کر
خوش ہوں کہ میرے ہونٹوں پہ کوئی دُعا نہ تھی

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن فرازؔ ہم
بدنام یُوں ہوئے کہ بدن پر قبا نہ تھی

جو بھی دُکھ یاد نہ تھا یاد آیا
آج کیا جانیے کیا یاد آیا

پھر کوئی ہاتھ ہے دل پر جیسے
پھر ترا عہدِ وفا یاد آیا

جس طرح دُھند میں لپٹے ہوئے پھُول
ایک اک نقش ترا یاد آیا

ایسی مجبوری کے عالم میں کوئی
یاد آیا بھی تو کیا یاد آیا

اے رفیقو سرِ منزل جا کر
کیا کوئی آبلہ پا یاد آیا

یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا
پھر نہیں یاد کہ کیا یاد آیا

جب کوئی زخم بھرا داغ بنا
جب کوئی بھول گیا یاد آیا

یہ محبت بھی ہے کیا روگ فرازؔ
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

سوال

(فراق کی تصویر دیکھ کر)

ایک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبوُر، نڈھال، زخم خورُدہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اُجاڑ زندگی کے
لمحات کی اَن گنت خراشیں

آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں
رُوٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں

سانسوں کی تھکن بدن کی ٹھنڈک
احساس سے کب تلک لہو لے
ہاتھوں میں کہاں سکت کہ بڑھ کر
خود ساختہ پیکروں کو چھُو لے

یہ زخم طلب یہ نامُرادی
ہر بُت کے لبوں پہ ہے تبسّم
اے تیشہ بدست دیوتاؤ!
تخلیق عظیم ہے کہ خالق
انسان جواب چاہتا ہے

غریبِ شہر کے نام

غریبِ شہر تری دُکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب، تری چاہت تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنّائے دلربا پہ سلام
حدیثِ درد و سکوتِ سخن ادا پہ سلام

دریدہ دل! ترے آہنگِ سازِ غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگِ چشمِ نم پہ نثار

جنوں کا شہر ہے آباد فصلِ دار کی خیر
ہر ایک دل ہے گریباں بھری بہار کی خیر
بجھے ہیں بام مگر شمع رہگذار کی خیر
تمام عمر تو گزرے اس انتظار کی خیر

رُخِ نگار و غمِ یار کو نظر نہ لگے
گلہ نہیں ہے اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے

دلِ و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں
شمارِ زخم عبث ہے نجات سے پہلے
کچھ اور دیدۂ خوں رنگ کو گلاب کریں
صبا کا ذکر قیامت ہے، رات سے پہلے

ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی
بہ سینہ رہ سپرم دست و پا بریدہ سہی

○

زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ جن کے لئے رُک رُک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ اِک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

یہ بھی اندازِ سخن ہے کہ جفا کو تیری
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں

جب تلک دُور ہے تو تیری پرستش کرلیں
ہم جسے چھُو نہ سکیں اُس کو خدا کہتے ہیں

کیا تعجّب ہے کہ ہم اہلِ تمنّا کو فراز
وُہ جو محرُومِ تمنّا ہیں بُرا کہتے ہیں

گُل ہو چراغِ مے تو سزاوارِ سنگ ہیں
مینا سرشت ہم بھی شہیدانِ رنگ ہیں

مطرب کی بے دِلی ہے کہ محفل کی بے حسی
کِس تیغ سے ہلاک نواہائے چنگ ہیں؟

دل خلوتِ خیال کی آرائشوں میں گُم
آنکھیں نگار خانۂ ہستی پہ دنگ ہیں

تابِ تواں نہیں ہے مگر حوصلے تو دیکھ
شیشہ صفات پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں

اے حسنِ سادہ دل تری رسوائیاں نہ ہوں
کچھ لوگ کشتۂ ہوسِ نام و ننگ ہیں

معذور ہیں تلوّن، خاطر کو کیا کریں
ہم خود فراز اپنی طبیعت سے تنگ ہیں

○

وہی جنوں ہے وہی کوچۂ ملامت ہے
شکستِ دل پہ بھی عہدِ وفا سلامت ہے

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں
تو مدعا وُہ گُلِ تر وُہ سرو قامت ہے

بجا یہ فرصتِ ہستی مگر دلِ ناداں
نہ یاد کر کے اسے بھولنا قیامت ہے

چلی چلے یونہی رسمِ وفا و مشقِ ستم
کہ تیغِ یار و سرِ دوستاں سلامت ہے

سکوتِ بحر سے ساحل لرز رہا ہے مگر
یہ خامشی کسی طوفان کی علامت ہے

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

پیغام بر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دکھ کی تاریکی لئے
تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انباروں کو کاندھوں پر دھرے
بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مو افسردہ رو خونیں لباس
ہونٹ محرومِ تکلّم پر سراپا التماس
اس تمنّا پر کہ تم کو مل سکے

غم کے انباروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن — جینے کی آس
ہیں مگر کرنوں کا سود اگر نہیں
ہیں نہیں جوہر شناس
صورت انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دِل ہیں قہقہوں سے چوُر
لیکن آنکھ سے آنسوُ رواں
سب کے سینوں میں امیدوں کے چراغاں
اور چہروں پر شکستوں کا دھُواں
زندگی سب سے گریزاں
سوئے مقتل سب رواں
سب نحیف و ناتواں
سب کے سب اک دوسرے کے ہمسفر
اک دوسرے سے بدگماں

سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس
میری باتوں سے میری آواز سے
تم نے یہ جانا کہ میں بھی
لے کے آیا ہوں تمہارے واسطے وُہ معجزے
جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمہارے
اَن گنت صدیوں کے لاتعداد زخم
دَم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم
منتظر ہیں قم باذنی کی صدائے سحر کے
ایشیا پیغمبروں کی سرزمیں
اور تم اس کے زبوں قسمت مکیں ... تیرہ جبیں
من و سلویٰ کے لئے دامن کشا
قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں
صرف تقدیر و توکّل پر یقیں
تم کو شیرینِ طرب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی سل کو

بپھرنے کا حوصلہ، یارا نہیں
تم یدِ بیضا کے قائل، بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں
تم کہ ہو گوشہ گرفتہ .... زندگی سے دُور
مُردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشیں
خاکداں کی اس گلِ تاریک کا
میں بھی اک پیکر ہوں، پیکر گر نہیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں پہ استادہ ہو تم
سایۂ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمہارا حرزِ دیں
سات قلزم موجزن چاروں طرف
اور تمہارے بخت میں شبنم نہیں
اپنے اپنے دُکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو
تم نے کھولا ہے کبھی ؟
اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی ؟

سب کی رُوحیں گرسنہ ... سب کی متاعِ دردیں
دُوسروں کا خون پینے کی ہوس
ایک کا دُکھ دُوسروں سے کم نہیں
ایک کا دُکھ تشنگی، بیچارگی
دُوسروں کا دُکھ مگر افراط مے .... دیوانگی
پیاس اور نشّے کا دُکھ
اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو
پیاس اور نشّے کا دُکھ اک دوسرے میں بانٹ لو
پھر تمھاری زندگی شائد نہ ہو
شاکیٔ عرشِ بریں ورحمت اللعالمیں
ہیں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

روز کی مسافت سے چُور ہو گئے دریا
پتھروں کے سینوں پر تھک کے سو گئے دریا

جانے کون کاٹے گا فصل لعل و گوہر کی
ریتلی زمینوں میں سنگ بو گئے دریا

اے سحابِ غم کب تک یہ گریز آنکھوں سے
انتظارِ طوفاں میں خشک ہو گئے دریا

چاندنی میں آتی ہے کس کو ڈھونڈنے خوشبو
ساحلوں کے پھولوں کو کب سے رو گئے دریا

*

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

دل چٹان کی صورت سیلِ غم پہ ہنستا ہے
جب نہ بن پڑا کچھ بھی داغ دھو گئے دریا

زخمِ نامرادی سے ہم فراز زندہ ہیں
دیکھنا سمندر میں غرق ہو گئے دریا

تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ
پھول روئے تو اسے خندۂ شاداب سمجھ

کہیں آ جائے میسر تو مقدر تیرا
ورنہ آسودگیٔ دہر کو نایاب سمجھ

حسرتِ گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں
خشک آنکھوں کو مری چشمۂ بے آب سمجھ

موجِ دریا ہی کو آوارۂ صد شوق نہ کہہ
ریگِ ساحل کو بھی لبِ تشنۂ سیلاب سمجھ

یہ بھی وا ہے کسی مانوس کرن کی خاطر
روزنِ در کو بھی اک دیدۂ بے خواب سمجھ

اب کسے ساحلِ امید سے تکتا ہے فرازؔ
وہ جو اک کشتیٔ دل تھی اسے غرقاب سمجھ

خدائے برتر

خدائے برتر
مری محبت
تری محبّت کی رفعتوں سے عظیم تر ہے
تری محبّت کا در خورِ اعتنا
فقط بیکراں سمندر
کہ جس کی خاطر
سدا تری رحمتوں کے بادل
کبھی کسی آبشار کی نغمگی کے موتی

کبھی کسی آبجو کے آنسو

کبھی کسی جھیل کے ستارے
کہیں سے شبنم کہیں سے چشمے کہیں سے دریا اڑا کے لائے
کہ تیرے محبوب کو جلال و جمال بخشیں
تری محبّت تو اس شہنشاہ کی طرح ہے
جو دُوسروں کے ہنر سے، خونِ جگر سے
اپنی وفا کو دوام بخشے
مگر مری بے بساط چاہت
فقط مرے آنسوؤں سے
میرے لہُو سے ... میری ہی آبرُو سے
رہی ہے زندہ
اگرچہ اس بے بضاعتی نے
مجھے ہمیشہ شکست دی ہے

مگر یہ ناکامیٔ تمنا بھی
اس محبت سے کامراں تر عظیم تر ہے
جو اپنی سطوت کے بل پر
اوروں کی آہ و زاری سے
اپنے جذبِ وفا کی تشہیر چاہتی ہے
مری محبت نے
جو بھی نام حبیب سے کر دیا معنون
وہ حرف میرا ہے، میرا اپنا ہے
اے خدائے بزرگ و برتر

○

قربِ جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی
تو نہیں ہے تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل کے زخموں کو نہ رو، دوست کا احسان سمجھ
ورنہ وہ دستِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوچتا ہوں تو ہر اک نقش میں دنیا آباد
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

یوسفِ شعر کو کس مصر میں لائے ہو فراز
ذوقِ آشفتہ نوائی نہیں دیتا کچھ بھی

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اَب اسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صُبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گُل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اِک شخص ہے مُنہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آجاتی تھی ساری دُنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھُلا ہے اتنا
ہے وُہی مجھ کو سرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وُہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

یہ کن نظروں سے تونے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بار ہا دیکھا نہ جائے

غلط ہے جو سُنا، پر آزما کر
تجھے اے بے وفا دیکھا نہ جائے!

یہ محرومی نہیں پاسِ وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے

یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے

فرازؔ اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جُدا دیکھا نہ جائے

خود غرض

اے دل! اپنے درد کے کارن تو کیا کیا بیتاب رہا
دِن کے ہنگاموں میں ڈوبا راتوں کو بے خواب رہا
لیکن تیرے زخم کا مرہم تیرے لئے نایاب رہا

پھر اک انجانی صورت نے تیرے دُکھ کے گیت سُنے
اپنی سُندرتا کی کرنوں سے چاہت کے خواب بُنے
خود کانٹوں کی باڑھ سے گزری تیری راہ میں پھول چُنے

اے دل جس نے تیری محرومی کے داغ کو دھویا تھا
آج اُس کی آنکھیں پُرنم تھیں اور تو سوچ میں کھویا تھا
دیکھ پرائے دُکھ کی خاطر تو بھی کبھی یوں رویا تھا؟

وابستگی

آ گئی پھر وہی پہاڑ سی رات
دوش پر ہجر کی صلیب لئے
ہر ستارہ ہلاکِ صبح طلب
منزلِ خواہش حبیب لئے

اس سے پہلے بھی شام وصل کے بعد
کاروانِ دل و نگاہ چلا
اپنی اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے
ہر کوئی سوئے قتل گاہ چلا

کتنی باہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں
کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہوئے
کتنی آنکھوں سے چھن گئے موتی
کتنے چہروں کے رنگ خاک ہوئے

پھر بھی ویراں نہیں ہے کوئے مراد
پھر بھی شب زندہ دار ہیں زندہ
پھر بھی روشن ہے بزم رسمِ وفا
پھر بھی ہیں کچھ چراغ تابندہ

وہی قاتل جو اپنے ہاتھوں سے
ہر مسیحا کو دار کرتے ہیں
پھر اسی کی مراجعت کے لئے
حشر تک انتظار کرتے ہیں

دِل بھی بُجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مر جائیے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں

آنکھوں کی سُرخ لہر ہے موجِ سُپردگی
یہ کیا ضرور ہے کہ اب انگڑائیاں بھی ہوں

ہر حُسنِ سادہ لوح نہ دِل میں اُتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

دُنیا کے تذکرے تو طبیعت ہی لے بجھے
بات اُس کی ہو تو پھر سخن آرائیاں بھی ہوں

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

○

جب تری یاد کے جگنو چمکے
دیر تک آنکھ میں آنسو چمکے

سخت تاریک ہے دل کی دُنیا
ایسے عالم میں اگر تو چمکے

ہم نے دیکھا سرِ بازارِ وفا
کبھی موتی کبھی آنسو چمکے

شرط ہے شدّتِ احساسِ جمال
رنگ تو رنگ ہے خوشبوُ پہ چمکے

آنکھ مجبوُرِ تماشا ہے فرازؔ
ایک صوُرت ہے کہ ہر سُو چمکے

ممدُوح

میں نے کب کی ہے ترے کاکل و لب کی تعریف
میں نے کب لکھے قصیدے ترے رُخساروں کے
میں نے کب تیرے سراپا کی حکایات کہیں
میں نے کب شعر کہے جھومتے گلزاروں کے
جانے دو دِن کی محبت میں یہ بھٹکے ہوئے لوگ
کیسے افسانے بنا لیتے ہیں دلداروں کے

مَیں کہ شاعر تھا مرے فن کی روایت تھی یہی
مجھ کو اِک پھُول نظر آئے تو گلزار کہوں
مسکراتی ہُوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں
ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں
میری فطرت تھی کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر
ہر حسیں لفظ کو در مدحِ رُخِ یار کہوں

میرے دل میں بھی کھلے ہیں تری چاہت کے کنول
ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے
مجھے گر ہو بھی تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ
تو ہے وُہ شمع کہ پتھر کی بھی پروانہ کرے
مَیں نہیں کہتا کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی
ورنہ شوریدگیٔ شوق تو دیوانہ کرے

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دیکھا
تیرے دُکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے سوا
میرے پیکر میں تری ذات گھُلی ہے اتنی
کہ مرا جسم مری رُوح نہیں تیرے سوا
میرا موضوعِ سُخن تو ہو کہ ساری دُنیا
درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

پیام آئے ہیں اُس یارِ بے وفا کے مجھے
جسے قرار نہ آیا کہیں بُھلا کے مجھے

جُدائیاں ہوں تو ایسی کہ عُمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم
کہ لے اُڑا ہے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اُداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اُٹھا کے مجھے

کھنچی ہوئی ہے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
فرازؔ دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے

○

بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا
تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے جدا ہو جانا

میں بھی پلکوں پہ سجا لوں گا لہو کی بوندیں
تم بھی پابستۂ زنجیرِ حنا ہو جانا

گرچہ اب قرب کا امکاں ہے بہت کم پھر بھی
کہیں مل جائیں تو تصویر نما ہو جانا

صرف منزل کی طلب ہو تو کہاں ممکن ہے
دُوسروں کے لئے خود آبلہ پا ہو جانا

خلق کی سنگ زنی میری خطاؤں کا صلہ
تم تو معصوم ہو تم دُور ذرا ہو جانا

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا

اے نگارِ گُل

نگارِ گل تجھے وُہ دِن بھی یاد ہوں شاید
کہ جن کے ذکر سے اَب دِل پہ تازیانہ لگے

تری طلب میں وُہ دار و رسن کے ہنگامے
کہ جن کی بات کریں بھی تو اَب فسانہ لگے

بقدرِ ذوق جلاتے رہے لہُو کے چراغ
کہ تو جب آئے تو یہ گھر نگار خانہ لگے

اسی خیال سے ہر زخم اپنے دل پہ سہا
کہ تجھ کو گردشِ ایام کی ہوا نہ لگے

مگر جو گزری ہے ہم پر ترے حصول کے بعد
وہ حالِ غم بھی کہیں گر تجھے بُرا نہ لگے

نگارِ گل وہ ہمیں تھے ترے تمنائی
کہ جن کے خوں سے ترے رنگ تابناک ہوئے

ہمیں ہیں جن سے قبا تیری لالہ رنگ ہوئی
ہمیں ہیں وہ جو تری رہگذر میں خاک ہوئے

خزاں تو خیر ستم کیشیوں کی رُت تھی مگر
بہار میں بھی ہمارے جگر ہی چاک ہوئے

ہمیں منارۂ کسریٰ کو توڑنے والے
ترے حریم میں آ کر ہمیں ہلاک ہوئے

نگارِ گُل یہ تقاضا مگر وفا کا ہے
کہ اب بھی ہم ترے وعدوں کا اعتبار کریں

گزر گئی جو گزرنی تھی سخت جانوں پر
پھر آج تیری جفاؤں کا کیا شمار کریں

الم گزیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی
مگر لبوں پہ غمِ دل نہ آشکار کریں

یہی اصول رہا ہے وفا پرستوں کا
ہر ایک حال میں توصیفِ حسنِ یار کریں

جبیں سے دھو کے ہر اک نقش نامرادی کا
نگارِ گل ترے جلووں کا انتظار کریں

گُمشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو!

عمر گزری ہے سجاتے ہوئے بام و در کو
اس تمنّا پہ کہ وُہ جانِ بہار آئے گی

فرشِ رہ دیدہ و دل تھے کہ وُہ آسُودہ خرام
دَرد کی آگ کو گلزار بنا جائے گی

اس توقع پر خرابے رہے آغوش کشا
کُھل کے برسے گی اگر اب کے گھٹا چھائے گی

ایک اک لمحہ قیامت کی طرح گزرا ہے
آخر کار وُہ محبُوب نظر بھی آئی

منتظر آنکھیں تو پتھرا ہی چکی تھیں لیکن،
کشتگانِ شبِ فرقت کی سحر بھی آئی

جسم کیُوں شل ہیں دھڑکتے ہوئے دل کیُوں چپ ہیں
جرسِ گُل کی تو آواز ادھر بھی آئی

آج پھر کرتے ہو کس زعم پہ زخموں کا شمار
سر پھرو! وادیٔ پُرخار ہیں یہ تو ہو گا

کیوں نگاہوں میں ہے افسردہ چراغوں کا دھواں
آرزوئے لبِ رُخسار ہیں یہ تو ہو گا

ایک سے ایک کڑی منزل جاں آئے گی
رہگذارِ طلبِ یار میں یہ تو ہو گا

ہونٹ سِل جائیں مگر جراُتِ اظہار رہے
دِل کی آواز کو مدھم نہ کرو دیوانو!

ڈھل چکی رات تو اب کہر بھی چھٹ جائیگی
اب بھی اُمید کی لو کم نہ کرو دیوانو!

آندھیاں آیا ہی کرتی ہیں ہر اک حبس کے بعد
گُلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو دیوانو!

دِل میں اب طاقت کہاں خونابہ افشانی کرے
وَرنہ غم وُہ زہر ہے پتھّر کو بھی پانی کرے

عقل وُہ ناصح کہ ہر دم لغزشِ پا کا خیال
دِل وہ دیوانہ یہی چاہے کہ نادانی کرے

ہاں مجھے بھی ہو گلہ بے مہریٔ حالات کا
تجھ کو آزردہ اگر میری پریشانی کرے

یہ تو اِک شہرِ جنوں ہے چاک داماں نو! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

موسمِ گُل ہے مگر بے رنگ ہے، شاخِ مژہ
کتنا شرمندہ ہمیں آنکھوں کی ویرانی کرے

ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

ناصحوں کو کون سمجھائے نہ سمجھے گا فرازؔ
وُہ تو سب کی بات سُن لے اور من مانی کرے

○

بے سروساماں تھے لیکن اتنا اندازہ نہ تھا
اس سے پہلے شہر کے لُٹنے کا آوازہ نہ تھا

ظرفِ دل دیکھا تو آنکھیں کرب سے پتھرا گئیں
خون رونے کی تمنّا کا یہ خمیازہ نہ تھا

آ مرے پہلو میں آ اے رونقِ بزمِ خیال،
لذّتِ رخسار و لب کا اب تک اندازہ نہ تھا

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی تری آمد کے بعد
کون سا گُل تھا کہ گلشن میں تر و تازہ نہ تھا

ہم قصیدہ خواں نہیں اُس حسن کے لیکن فرازؔ
اتنا کہتے ہیں رہینِ سُرمہ و غازہ نہ تھا

○

تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہُو کی اِک بُوند
دِل میں اِک لہر اُٹھی آنکھ سے دریا برسا

کوئی غرقاب کوئی ماہیٔ بے آب ہُوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیسا برسا

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اُٹھانے والے
چند بُوندیں ہی سرِ دامنِ صحرا برسا

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ اُٹھا، یا برسا

ابر و باراں کے خُدا، جھُومتا بادل نہ سہی
آگ ہی اب سرِ گلزارِ تمنّا برسا

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فرازؔ
اور جہاں وُہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برسا

○

افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی
اے زہرِ غم یار بہت ہو چکی بس بھی

یہ حبس تو جلتی ہُوئی رُت سے بھی گراں ہے
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب تو برس بھی

آئینِ خرابات معطّل ہے تو کچھ روز
اے رندِ بلا نوش و تہی جام ترس بھی

صیّاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی

محرومیٔ جاوید گنہگار نہ کر دے
بڑھ جاتی ہے کچھ ضبطِ مسلسل سے ہوس بھی

اے مرے بیدرد شہر

دِل سُلگ اُٹھتا ہے اپنے بام و در کو دیکھ کر
پھیلنے لگتی ہیں جب بھی شام کی پرچھائیاں
اس قدر ویران لمحے، اس قدر سنسان رُت
سوچ میں گُم ہیں اُفق سے تا اُفق پہنائیاں
کس لیے روشن کروں دیوار و در کوئی تو ہو
گنگ دیواروں میں کیا ہوں انجمن آرائیاں

درد ہر شب جاگ اُٹھتے ہیں کئی ماہ و نجوم
آگ بھڑکاتی ہیں سنگ و خشت کی رعنائیاں

راستوں سے خوابگاہوں تک مسلسل موج رنگ
جس طرح قوسِ قزح کی ٹوٹتی انگڑائیاں
زخم نظارہ لئے آنکھوں میں چپ تکتا رہا
گو مری نیندیں بھی مجھ سے لے اڑیں تنہائیاں

کل ذرا سی دیر چمکے تھے مرے دیوار و در
جھلملا اُٹھیں تھیں میری رُوح کی گہرائیاں
چند لمحوں کے لئے لَو دے اٹھا تھا اک چراغ
اَور دمک اُٹھی تھیں کچھ لمحے مری تنہائیاں
آج اتنا شور کیوں ہے اے مرے بیدرد شہر
ہر نظر میری طرف ہے، اس قدر رسوائیاں؟

○

گھر میں کتنا سنّاٹا ہے باہر کتنا شور
یا دُنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں بھی آ کر ناچ
دل میں کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مور

یُوں پھرتے ہیں گلیوں میں گھبرائے گھبرائے سے
جیسے اس بستی کے سائے بھی ہوں آدم خور

سوچ کی چنگاری بھڑکا کر کیا نادانی کی
اس لمحے سے لیکر اب تک آگ ہے چاروں اور

چاک گریباں پھرنا کس کو خوش آتا ہے فرازؔ
ہم بھی اس کو بھول نہ جائیں دل پہ اگر ہو زور

پھر اسی راہگذر پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید

جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہمسفر شاید

جان پہچان سے بھی کیا ہو گا
پھر بھی اے دوست غور کر شاید

اجنبیت کی دُھند چھٹ جائے
چمک اُٹھے تری نظر شاید

زندگی بھر لہُو رُلائے گی
یادِ یاران بے خبر شاید

جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فراز
پھر بھی تو انتظار کر شاید

○

اَب وُہ جھونکے کہاں صبا جیسے
آگ ہے شہر کی ہوا جیسے

شب سُلگتی ہے دوپہر کی طرح
چاند، سورج سے جل بجھا جیسے

مدّتوں بعد بھی یہ عالم ہے
آج ہی تو جُدا ہُوا جیسے

اس طرح منزلوں سے ہو۱ محروم
مَیں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

اب بھی ویسی ہے دُوریٔ منزل
ساتھ چلتا ہو راستہ جیسے

اتفاقاً بھی زندگی میں فرازؔ
دوست ملتے نہیں ضیاؔ جیسے

---

۱ : ضیاءالدین ضیاؔ

تریاق

جب تیری اُداس انکھڑیوں میں
پل بھر کو چمک اُٹھے تھے آنسو،
کیا کیا نہ گزر گئی تھی دل پر!
جب میرے لئے ملول تھی تو

کہنے کو وُہ زندگی کا لمحہ
پیمانِ وفا سے کم نہیں تھا
ماضی کی طویل تلخیوں کا
جیسے مجھے کوئی غم نہیں تھا

تو! میرے لئے! اُداس اتنی
کیا تھا یہ اگر کرم نہیں تھا

تو آج بھی میرے سامنے ہے
آنکھوں میں اُداسیاں نہ آنسو
ایک طنز ہے تیری ہر ادا میں
چبھتی ہے ترے بدن کی خوشبو
یا اب مرے زخم بھر چکے ہیں
یا سب مرا زہر پی چکی تو

○

مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں
لاکھ سمجھایا کہ اس محفل میں اب جانا نہیں

خود فریبی ہی سہی کیا کیجیے دل کا علاج
تو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں

ایک دُنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

جی میں جو آتی ہے کر گزرو کہیں ایسا نہ ہو
کل پشیماں ہوں کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں

زندگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہو گا فرازؔ
اس کا یہ کہنا کہ تُو شاعر ہے دیوانہ نہیں

تو پاس بھی ہو تو دل بیقرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں رازدار اپنا ہے

وہ دور ہو تو بجا ترکِ دوستی کا خیال
وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا لیا دل سے
اس آسرے پہ کہ اک غمگسار اپنا ہے

بلا سے جاں کا زیاں ہو اِس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

فرازؔ راحتِ جاں بھی وہی ہے کیا کیجے
وُہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

○

جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
دیکھا تو وُہ تصویر ہر اک دِل سے لگی تھی

تنہائی میں روتے ہیں کہ یُوں دل کو سکوں ہو
یہ چوٹ کسی صاحبِ محفل سے لگی تھی

اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا
بے درد ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی

خلقت کا عجب حال تھا اس کوئے ستم میں
سائے کی طرح دامنِ قاتل سے لگی تھی

اُترا بھی تو کب درد کا چڑھتا ہُوا دریا
جب کشتیٔ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

○

کسی کے تذکرے بستی میں کو بکو جو ہوئے
ہمیں خموش تھے موضوعِ گفتگو جو ہوئے

نہ دِل کا درد ہی کم ہے نہ آنکھ ہی نم ہے
نہ جانے کون سے ارمان تھے وُہ لہُو جو ہوئے

نظر اُٹھائی تو گم گشتۂ تحیّر تھے
ہم آئینے کی طرح تیرے روبرو جو ہوئے

ہمیں ہیں وعدۂ فردا پہ ٹالنے والے
ہمیں نے بات بدل دی بہانہ جُو جو ہوئے

فرازؔ ہو کہ وُہ فرہاد ہو کہ ہو منصُور
انہیں کا نام ہے ناکام آرزُو جو ہوئے

مجھ سے پہلے

مجھ سے پہلے تجھے جس شخص نے چاہا اس نے
شاید اب بھی ترا غم دل سے لگا رکھا ہو
ایک بے نام سی اُمید پہ اب بھی شاید،
اپنے خوابوں کے جزیروں کو سجا رکھا ہو،

مَیں نے مانا کہ وُہ بیگانۂ پیمانِ وفا
کھو چکا ہے جو کسی اور کی رعنائی میں

شاید کہ اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں
اور کوئی دُکھ نہ رُلائے تجھے تنہائی میں

میں نے مانا کہ شب و روز کے ہنگاموں میں
وقت ہر غم کو بھلا دیتا ہے رفتہ رفتہ
چاہے اُمید کی شمعیں ہوں کہ یادوں کے چراغ
مستقل بُعد بجھا دیتا ہے رفتہ رفتہ

پھر بھی ماضی کا خیال آتا ہے گاہے گاہے
مُدّتیں دَرد کی لو کم تو نہیں کر سکتیں
زخم بھر جائیں مگر داغ تو رہ جاتا ہے
دُوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مر سکتیں

یہ بھی ممکن ہے کہ اک دن وُہ پشیماں ہو کر
تیرے پاس آئے زمانے سے کنارا کر لے
تو کہ معصُوم بھی ہے زود فراموش بھی ہے
اس کی پیماں شکنی کو بھی گوارا کر لے

اَور میں، جس نے تجھے اپنا مسیحا سمجھا،
ایک زخم اور بھی پہلے کی طرح سہہ جاؤں
جس پہ پہلے بھی کئی عہدِ وفا ٹوُٹے ہیں
اِسی دوراہے پہ چپُ چاپ کھڑا رہ جاؤں

○

کروں نہ یاد، مگر کس طرح بھلاؤں اسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں، اب کہاں سے لاؤں اسے

مگر وُہ زود فراموش، زود رنج بھی ہے
کہ رُوٹھ جائے، اگر یاد کچھ دلاؤں اُسے

وہی جو دَولتِ دل ہے وہی جو راحتِ جاں
تمہاری بات پہ اے ناصحو! گنواؤں اُسے

جو ہمسفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے فراز
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اُسے

○

اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم

صحرائے زندگی میں کوئی دُوسرا نہ تھا
سُنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق
آ تیرے راستے میں ستارے لٹائیں ہم

وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فرازؔ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بھی رلائیں ہم

○

اُتر رہی تھی شہرِ گُل میں کوئی آتشیں کرن
وُہ روشنی ہُوئی کہ سُلگنے لگے بدن

غارت گرِ چمن سے عقیدت تھی کس قدر
شاخوں نے خود اتار دیئے اپنے پیرہن

اس انتہائے قُرب نے دُھندلا دیا تجھے
کچھ دُور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

میں بھی تو کھو چلا تھا زمانے کے شور میں
یہ اتفاق ہے کہ وہ یاد آ گئے معاً

جس کے طفیل مہر بلب ہم رہے فراز
اس کے قصیدہ خواں ہیں سبھی اہلِ انجمن

کوئی بھٹکتا بادل

دُور اِک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل
میری جلتی ہُوئی بستی کی طرف آئے گا
کتنی حسرت سے اسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں
اور وُہ وقت کی مانند گزر جائے گا

جانے کس سوچ میں کھو جائے گی دِل کی دُنیا
جانے کیا کیا مجھے بیتا ہوا یاد آئے گا
اور اس شہر کا بے فیض بھٹکتا بادل
دَرد کی آگ کو پھیلا کے چلا جائے گا۔

○

کیسی طلب اور کیا اندازے مشکل ہے تقدیر بنے
دل پر جس کا ہاتھ بھی رکھیو آخر وہ شمشیر بنے

غم کے رشتے بھی نازک تھے تم آئے اور ٹوٹ گئے
دل کا وحشی اب کیا سنبھلے اب کیا شئے زنجیر بنے

اپنا لہو تیری رعنائی تاریکی اس دنیا کی
میں نے کیا کیا رنگ چُنے ہیں دیکھوں کیا تصویر بنے

اپنا یہ عالم ہے خود سے بھی اپنے زخم چھپاتے ہیں
لوگوں کو یہ فکر کہ کوئی موضوعِ تشہیر بنے

تم نے فراز اِس عشق میں سب کچھ کھو کر بھی کیا پایا ہے
وُہ بھی تو ناکامِ وفا تھے جو غالبؔ اور میرؔ بنے

○

اپنی محبّت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے
رسوائی سے ڈرنے والو بات تمہی پھیلاؤ گے

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبّت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے

ہجر کے ماروں کی خوش فہمی! جاگ رہے ہیں پہروں سے
جیسے یُوں شب کٹ جائیگی جیسے تم آجاؤ گے

زخمِ تمنّا کا بھر جانا گویا جان سے جانا ہے
اس کا بھلانا سہل نہیں ہے خود کو بھی یاد آؤ گے

چھوڑو عہدِ وفا کی باتیں کیوں جھوٹے اقرار کریں
کل میں بھی شرمندہ ہوں گا کل تم بھی پچھتاؤ گے

رہنے دو یہ پند و نصیحت ہم بھی فرازؔ سے واقف ہیں
جس نے خود سو زخم سہے ہوں اس کو کیا سمجھاؤ گے

زندگی! اے زندگی

میں بھی چپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!
جب تلک روشن ہیں آنکھوں کے فسردہ طاقچے
نیلگوں ہونٹوں سے پھوٹے گی صدا کی روشنی
جسم کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامے ہوئے
موم کے بت آتشیں چہرے سلگتی مورتیں
میری بینائی کی یہ مخلوق زندہ ہے ابھی
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!

ہو تو جانے دے مرے لفظوں کو معنی سے تہی
میری تحریریں، دھوئیں کی رنگتی پرچھائیاں
جن کے پیکر اپنی آوازوں سے خالی بے لہو !
محو ہو جانے تو دے یادوں سے خوابوں کی طرح
رُک تو جائیں آخری سانسوں کی وحشی آندھیاں
پھر ہٹا لینا مرے ماتھے سے تو بھی اپنا ہاتھ
میں بھی چُپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر ! اے زندگی ! اے زندگی !

○

چند لمحوں کے لئے تُو نے مسیحائی کی
پھر وُہی میں ہُوں وُہی عمر ہے تنہائی کی

کس پہ گزری نہ شبِ ہجر قیامت کی طرح
فرق اتنا ہے کہ ہم نے سخن آرائی کی

اپنی باہوں میں سمٹ آئی ہے وہ قوسِ قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کئے انگڑائی کی

غیرتِ عشق بجا طعنۂ یاراں تسلیم
بات کرتے ہیں مگر سب اسی ہرجائی کی

ان کو بھولے ہیں تو کچھ اور پریشاں ہیں فرازؔ
اپنی دانست میں دل نے بڑی دانائی کی

زعم ایسا کیا کہ لطفِ دوست ٹھکرانا پڑے
یہ طبیعت ہے تو شاید جاں سے بھی جانا پڑے

خانہ ویرانی تو ہوتی ہے مگر ایسی کہاں
اپنی آنکھوں سے خود اپنا گھر نہ پہچانا پڑے

رسم چل نکلی عجب اب میکدے کی خیر ہو
ہے وہی جمشید جس کے ہاتھ پیمانہ پڑے

سوچ لو اس بزم سے اٹھنے سے پہلے سوچ لو
یہ نہ ہو پھر دل کے ہاتھوں لوٹ کر آنا پڑے

لے چلے ہیں حضرتِ ناصح مجھے جس راہ سے
لطف جب آئے اُدھر بھی کوئے جاناں نہ پڑے

غم ہی ایسا تھا کہ دل شق ہو گیا ورنہ فراز
کیسے کیسے حادثے ہنس ہنس کے سہہ جانا پڑے

○

اب نہ فرصت ہے، نہ احساس ہے غم سے اپنے
ورنہ ہم روز ہی ملتے تھے صنم سے اپنے

دل نہ مانا کہ کسی اور کے رستے پہ چلیں
لاکھ گمراہ ہوئے نقشِ قدم سے اپنے

جی چکے ہم جو یہی شوق کی رسوائی ہے
تم سے بیگانے ہوئے جاتے ہیں ہم سے اپنے

ہم نہیں پھر بھی تو آباد ہے محفل ان کی
ہم سمجھتے تھے کہ رونق ہے تو دم سے اپنے

میرے دامن کے مقدر میں ہے خالی رہنا
آپ شرمندہ نہ ہوں دستِ کرم سے اپنے

رہ چکے مرگِ تمنّا پہ بھی اِک عُمر فرازؔ
اب جو زندہ ہیں تو شعروں کے بھرم سے اپنے

یہ تو جب ممکن ہے...

پھر چلے آئے ہیں ہمدم لے کے ہمدردی کے نام
آئے ہوئے رم خوردہ کی وحشت بڑھانے کے لئے
میرے دِل سے تیری چاہت کو مٹانے کے لئے

چھیڑ کر افسانۂ ناکامیٔ اہلِ وفا
تیری مجبوری کے قصّے میری بربادی کی بات
اپنی اپنی سرگزشتیں دوسروں کے تجربات

ان کو کیا معلوم لیکن تیری چاہت کے کرم
میری تنہائی کے دوزخ میری جنّت کے بھرم
تیری آنکھوں کا وفا آمیز افسردہ خیال

کاش اتنا سوچ سکتے غمگساروں کے دماغ
یہ تو جب ممکن ہے بجھ جائے ہر آنسو ہر چراغ
خود کو ان میں دفن کر دوں بھول جاؤں اپنا نام

○

تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو
اب ہو چلا یقیں کہ بُرے ہم ہیں دوستو

کس کو ہمارے حال سے نسبت ہے کیا کہیں
آنکھیں تو دشمنوں کی بھی پُرنم ہیں دوستو

اپنے سوا ہمارے نہ ہونے کا غم کسے
اپنی تلاش میں تو ہمیں ہم ہیں دوستو

کچھ آج شام ہی سے ہے دل بھی بجھا بجھا
کچھ شہر کے چراغ بھی مدّھم ہیں دوستو

اِس شہرِ آرزو سے بھی باہر نکل چلو
اَب دِل کی رونقیں بھی کوئی دم ہیں دوستو

سَب کچھ سہی فراز پر اتنا ضرور ہے
دُنیا میں ایسے لوگ بہُت کم ہیں دوستو

○

تو کہاں تھا زندگی کے روز و شب آنکھوں میں تھے
آج یاد آیا کہ آنسو بے سبب آنکھوں میں تھے

رات بھر تاروں کی صورت جاگتے رہنا ہمیں
صبحدم کہنا کہ کیا کیا خوابِ شب آنکھوں میں تھے

تیری یادوں کی مہک ہر درد کو بہلا گئی
ورنہ تیرے دکھ بھی اے شہرِ طرب آنکھوں میں تھے

اب تلک جن کی جُدائی کا قلق جی کو نہ تھا
آج تو بچھڑا تو وہ بھی سب کے سب آنکھوں میں تھے

اب تو ضبطِ غم نے پتھر کر دیا ورنہ فرازؔ
دیکھتا کوئی کہ دِل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

لمحے وفورِ شوق کے ایسے نہ آئے تھے
یُوں چُپ ہیں تیرے پاس ہی جیسے نہ آئے تھے

ساقی شکستِ جام سے چہروں پہ دیکھنا
وہ رنگ بھی کہ شعلۂ مے سے نہ آئے تھے

دل پر لگی خراش تو چہرے شفق ہُوئے
اب تک تو زخم راس کچھ ایسے نہ آئے تھے

پہلے بھی روئے ہیں مگر اب کے وہ کرب ہے
آنسو کبھی بھی آنکھوں میں جیسے نہ آئے تھے

جب صبح ہو چکی ہے تو کیا سوچنا فراز
وہ رات کیوں نہ آئے تھے کیسے نہ آئے تھے

شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے نام

تم نے جس دن کے لئے اپنے جگر چاک کئے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنّا کو لہو سے سینچا
ہم نے اس کو گل و گلزار بنایا آخر
نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اک بوند نے طوفان اٹھایا آخر

تم نے اک ضربِ لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقتِ تاریک خرابوں کا وُہ عفریت ہے، جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے
زُلفِ آزادی کے ہر تار سے دستِ ایّام
حریّت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے
تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہوا
ہم پہ وُہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لئے جیت کی تمہید بنی

ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہہِ اُمید بنی
ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفّاک خُداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہُوئی شعلۂ خورشید بنی

پیمبرِ مشرق

وُہ شب کہ جس میں ترا شعلۂ نوا لپکا
ڈھلی تو ماتمِ یک شہرِ آرزُو بھی ہُوا
وُہ رُت کہ جس میں ترا نغمۂ جنوں گونجا
کٹی تو سازِ تمنّا لہُو لہُو بھی ہُوا

یہی بہُت تھا کوئی منزلِ طلب تو ملی
کہیں تو مژدۂ قربِ حریمِ یار ملا
ہزار شکر کہ طعنِ برہنگی تو گیا
اگرچہ پیرہنِ شوق تار تار ملا

خیال تھا کہ شکستِ قفس کے بعد بھی ہم
ترے پیام کے روشن چراغ دیکھیں گے
رہے گا پیشِ نظر تیرا آئینہ جس میں
ہم اپنے ماضی و فردا کے داغ دیکھیں گے

مگر جو حال طلوعِ سحر کے بعد ہُوا
جو تیرے درس کی تحقیر ہم نے دیکھی ہے
بیاں کریں بھی تو کس سے، کہیں تو کس سے کہیں
جو تیرے خواب کی تعبیر ہم نے دیکھی ہے

مدبّروں نے وفا کے چراغ گُل کر کے
دراز دستیٔ جاہ و حشم کو عام کیا
مفکرّوں نے فقیہوں کی دل دہی کے لئے
خودی کی مے میں تصوّف کا زہر گھول دیا

وُہ کم نظر تھے کہ نادان تھے کہ شعبدہ گر
جو تجھ کو جن و ملائیک کا ترجماں سمجھے
تری نظر میں ہمیشہ زمیں کے زخم رہے
مگر یہ تجھ کو مسیحائے آسماں سمجھے

عرُوجِ عظمتِ آدم تھا مدّعا تیرا
مگر یہ لوگ نقوشِ فنا اُبھارتے ہیں
کس آسماں پہ ہے تو اے پیمبرِ مشرق
زمیں کے زخم تجھے آج بھی پکارتے ہیں

اسی خیال میں تاروں کو رات بھر دیکھوں
کہ تجھ کو صبحِ قیامت سے پیشتر دیکھوں

اِس اک چراغ کی لَو چُبھ رہی ہے آنکھوں میں
تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھوں

مجھے خود اپنی طبیعت پہ اعتماد نہیں
خدا کرے کہ تجھے اب نہ عمر بھر دیکھوں

صدائے غولِ بیاباں نہ ہو یہ آوازہ
مرا وجود ہے پتھر جو لوٹ کر دیکھوں

نظر عذاب ہے پاؤں میں ہو اگر زنجیر
فضا کے رنگ کو دیکھوں کہ بال و پر دیکھوں

جُدا سبھی مری منزل بچھڑ نہیں سکتا
میں کس طرح تجھے اوروں کا ہمسفر دیکھوں

وُہ لب فراز اگر کر سکیں مسیحائی
بقول دردؔ میں سَو سَو طرح سے مر دیکھوں

○

(بطرزِ بیدل)

جنبشِ مژگاں کہ ہر دم دل کشائے زخم ہے
جو نظر اُٹھتی ہے گویا آشنائے زخم ہے

دیکھنا آئینِ مقتل دلفگارانِ وفا
التفاتِ تیغِ قاتل خوں بہائے زخم ہے

بسکہ جوشِ فصلِ گُل سے کھُل گئے سینوں کے چاک
خندۂ گُل بھی ہم آہنگ صدائے زخم ہے

ہم نفس! ہر آستیں میں دشنہ پنہاں ہے تو کیا
ہم کو پاسِ خاطرِ یاراں بجائے زخم ہے

آ تماشا کر کبھی اے بے نیازِ شامِ غم
دیدۂ بے خواب بھی چاکِ قبائے زخم ہے

کس سے جز دیوارِ مژگاں سیلِ دردِ دل رُکے
ساحلِ دریائے خوں لب آشنائے زخم ہے

ضبطِ گریہ، چشمِ خوں بستہ کو تھا عقدہ کشا
رہ گیا تھا دل میں جو آنسو بنائے زخم ہے

شعلۂ افسردگی ہے شمعِ فانوسِ خیال
داغ کیا ہے دل سے پیمانِ وفائے زخم ہے

اَب تو دامن تک پہنچ آیا سرِ چاکِ جنوں
ہم تو سمجھے تھے کہ بس دِل انتہائے زخم ہے

سلسلہ ہائے طلب سے رستگاری ہے کسے
دِل ہلاکِ ناوک و ناوک فدائے زخم ہے

چارہ گر نے بہرِ تسکیں رکھ دیا ہے دِل پہ ہاتھ
مہرباں ہے وُہ مگر ناآشنائے زخم ہے

میری وحشت کب ہُوئی رسوائے عریانی فراز
کل بدن پر پیرہن تھا اَب ردائے زخم ہے

المیہ

کس تمنّا سے یہ چاہا تھا کہ اک روز تجھے
ساتھ اپنے لئے اس شہر کو جاؤں گا جسے
مجھ کو چھوڑے ہوئے بھولے ہوئے اک عمر ہوئی

ہائے وُہ شہر کہ جو میرا وطن ہے پھر بھی
اس کی مانوس فضاؤں سے رہا بیگانہ
میرا دل میرے خیالوں کی طرح دیوانہ

آج حالات کا یہ طنزِ جگر سوز تو دیکھ
تو مرے شہر کے اک حجلۂ زرّیں میں مکیں
اور میں پردیس میں جاں دادۂ یک نانِ جویں

ملکیّت

سسکیاں لینے سے کیا فائدہ اے زینتِ شب
دیکھ اس ہنستی ہوئی رات کو افسردہ نہ کر
تیرا رونا بے تجھے تسکین تو دے سکتا ہے
لیکن اس انجمنِ عیش کو آزردہ نہ کر

مجھ پہ روشن ہے ترے سوئے ہوئے درد کی آگ
جبر کی بادہ گساری سے بھڑک اُٹھی ہے

تیری کچلی ہوئی غیرت تری رَوندی ہوئی رُوح
اک حقارت بھری ٹھوکر سے بھڑک اُٹھی ہے

اور یہ توہین ترے جسم کی توہین نہ تھی
ورنہ یہ زہر تو ہنس ہنس کے پیا ہے تُو نے
وقفِ گردش رہی ساغر کی طرح دست بدست
بزم کی بزم کو سرشار کیا ہے تُو نے

تُو نے ہر جلتی ہُوئی رُوح کو گلزار کیا
تُو ہر اک ہاتھ میں غنچے کی طرح چٹکی ہے
تُو نے ہر دوش پہ بکھرائی ہیں اپنی زُلفیں
تُو ہر آغوش میں خوشبو کی طرح بھٹکی ہے

مگر امشب ترے احساس پہ وُہ چوٹ پڑی
تلخ فاقوں کی اذیّت بھی بُھلا دی جس نے
تیرے کردار کے صحرا سے وُہ آندھی اُٹھی
فکرِ فردا کی بھی دیوار گرا دی جس نے

تجھ کو معلوم نہیں ہے مگر اے دشمنِ جاں
اس تجارت سے عبارت تری شخصیّت ہے
جسم سے لے کر تری رُوح تلک آج کی رات
یا مری یا مرے احباب کی ملکیّت ہے

○

منتظر کب سے تحیّر ہے تری تقدیر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکاتا رہے
مَیں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر
آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا

عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ بے مہر لوگ
جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جوئے شیر کا

جس کو بھی چاہا اسے شدّت سے چاہا ہے فرازؔ
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

○

اہلِ غم جاتے ہیں نا اُمید تیرے شہر سے
جب نہیں تجھ سے تو کیا اُمید تیرے شہر سے

دیدنی تھی سادگی ان کی جو رکھتے تھے کبھی
اے وفا نا آشنا اُمید تیرے شہر سے

تیرے دیوانوں کے حق میں زہرِ قاتل ہو گئی
نا اُمیدی سے سوا اُمید تیرے شہر سے

پا بجولاں دِل گرفتہ پھر رہے ہیں کُو بکُو
ہم جو رکھتے تھے سوا اُمید تیرے شہر سے

تُو تو بے پروا ہی تھا اب لوگ بھی پتھر ہوئے
یا ہمیں تجھ سے تھی یا اُمید تیرے شہر سے

راستے کیا کیا چمک جاتے ہیں اے جانِ فرازؔ
جب بھی ہوتی ہے ذرا اُمید تیرے شہر سے

تمثیل

کتنی صدیوں کے انتظار کے بعد
قربتِ یک نفس نصیب ہوئی
پھر بھی تو چپ اُداس کم آمیز

اے سُلگتے ہوئے چراغ بھڑک
درد کی روشنی کو چاند بنا
کہ ابھی آندھیوں کا شور ہے تیز

ایک پل مرگِ جاوداں کا صلہ
اجنبیت کے زہر میں مت گھول
مجھ کو مت دیکھ لیکن آنکھ تو کھول

آنکھوں میں چُبھ رہے ہیں در و بام کے چراغ
جب دِل ہی بجُھ گیا ہو تو کس کام کے چراغ

کیا شام تھی کہ جب ترے آنے کی آس تھی
اب تک جلا رہے ہیں ترے نام کے چراغ

شاید کبھی یہ عرصۂ یک شب نہ کٹ سکے
تو صبح کی ہوا ہے تو ہم شام کے چراغ

اس تیرگی میں لغزشِ پا بھی ہے خودکشی
اے رہ نوردِ شوق ذرا تھام کے چراغ

ہم کیا بجھے کہ جاتی رہی یادِ رفتگاں!
شاید ہمیں تھے گردشِ ایام کے چراغ

ہم درخورِ ہوائے ستم بھی نہیں فراز
جیسے مزار پر کسی گمنام کے چراغ

○

نظر کی دُھوپ میں سائے گھُلے ہیں شب کی طرح
میں کب اُداس نہیں تھا مگر نہ اب کی طرح

پھر آج شہرِ تمنّا کی رہگزاروں سے
گزر رہے ہیں کئی لوگ روز و شب کی طرح

تجھے تو میں نے بڑی آرزُو سے چاہا تھا
یہ کیا کہ چھوڑ چلا تُو بھی اور سب کی طرح

فسردگی ہے مگر وجۂ غم نہیں معلوم
کہ دل پہ بوجھ سا ہے رنجِ بے سبب کی طرح

کِھلے تو اب کے بھی گلشن میں پھول ہیں لیکن
نہ میرے زخم کی صورت نہ تیرے لب کی طرح

ہم کیا کہ اسی سوچ میں بادِ چمنی تھی
وہ گُل کی چٹک تھی کہ تری کم سخنی تھی

آنسو کی وہ اِک بُوند جو آنکھوں سے نہ ٹپکی
آئینۂ دل کے لئے ہیرے کی کنی تھی

پیمانے کو ہم مُنہ سے لگاتے نہ لگاتے
ساقی کی مُلاقات ہی توبہ شکنی تھی

اب صورتِ دیوار ہیں چپ چاپ کہ تجھ سے
کچھ اور تعلق نہ سہی ہم سخنی تھی

یہ جاں جو کڑی دھوپ میں جلتی رہی برسوں
اوروں کے لئے سایۂ دیوار بنی تھی

دنیا سے بچھڑتے کہ فرازؔ ان کو بھلاتے
ہر حال میں اپنے لئے پیماں شکنی تھی

نیند

سرد پلکوں کی صلیبوں سے اُتارے ہوئے خواب
ریزہ ریزہ ہیں مرے سامنے شیشوں کی طرح
جن کے ٹکڑوں کی چبھن، جن کی خراشوں کی جلن
عمر بھر جاگتے رہنے کی سزا دیتی ہے
شدّتِ کرب سے دیوانہ بنا دیتی ہے

آج اِس قرب کے ہنگام وُہ احساس کہاں
دل میں وُہ درد نہ آنکھوں میں چراغوں کا دُھواں
اور صلیبوں سے اُتارے ہوئے خوابوں کی مثال
جسم گرتی ہُوئی دیوار کی مانند نڈھال
تو مرے پاس سہی اے مرے آزردہ جمال

خوشبو کا سفر

چھوڑ پیمانِ وفا کی بات شرمندہ نہ کر
دُوریاں .... مجبُوریاں، رُسوائیاں، تنہائیاں
کوئی قاتل، کوئی بسمل، سِسکیاں، شہنائیاں
دیکھ یہ ہنستا ہُوا موسم ہے موضوعِ نظر

وقت کی رَو میں ابھی ساحل ابھی موجِ فنا
ایک جھونکا ایک آندھی اک کرن اک جوئے خوں
پھر وُہی صحرا کا سناٹا وُہی مرگِ جنوں
ہاتھ ہاتھوں کا اثاثہ ہاتھ ہاتھوں سے جُدا

جب کبھی آئے گا ہم پر بھی جُدائی کا سماں
ٹوٹ جائے گا مرے دل میں کسی خواہش کا تیر
بھیگ جائے گی تری آنکھوں میں کاجل کی لکیر

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہُوا موسم، یہ خوشبو کا سفر

اَب کے برس بھی

لب تشنہ و نومید ہیں ہم اَب کے برس بھی
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اَب کے برس بھی

کچھ بھی ہو گلستاں میں مگر کنجِ چمن سے
ہیں دُور بہاروں کے قدم اَب کے برس بھی

اے شیخِ کرم! دیکھ کہ باوصفِ چراغاں
تیرہ ہیں در و بام حرم اَب کے برس بھی

اے دِل زدگاں! خیر مناؤ کہ ہیں نازاں
پندارِ خدائی پہ صنم، اَب کے برس بھی

ق

پہلے بھی قیامت تھی ستم کاریٔ ایام
ہیں کشتۂ غم، کشتۂ غم اب کے برس بھی
لہرائیں گے ہونٹوں پہ دکھاوے کے تبسّم
ہو گا یہ نظارہ کوئی دم اب کے برس بھی
ہو جائے گا ہر زخمِ کہن پھر سے نمایاں
روئے گا لہو دیدۂ نم اب کے برس بھی
پہلے کی طرح ہوں گے تہی جام سفالیں
چھلکے گا ہر اِک ساغرِ جم اب کے برس بھی
مقتل میں نظر آئیں گے پابستۂ زنجیر
اہلِ نظر و اہلِ قلم، اب کے برس بھی

○

تجھ سے مل کر بھی کچھ خفا ہیں ہم
بے مروّت نہیں تو کیا ہیں ہم

ہم غمِ کارواں میں بیٹھے تھے
لوگ سمجھے شکستہ پا ہیں ہم

اس طرح سے ہمیں رقیب ملے
جیسے مدّت کے آشنا ہیں ہم

راکھ ہیں ہم اگر یہ آگ بجھی
جز غمِ دوست اور کیا ہیں ہم

خود کو سُنتے ہیں اس طرح جیسے
وقت کی آخری صدا ہیں ہم

کیوں زمانے کو دیں فرازؔ الزام
وہ نہیں ہیں تو بے وفا ہیں ہم

○

تجھے اُداس کیا خود بھی سوگوار ہوئے
ہم آپ اپنی محبت سے شرمسار ہوئے

بلا کی رو تھی ، ندیمانِ آبلہ پا کو
پلٹ کے دیکھنا چاہا کہ خود غبار ہوئے

گِلہ اسی کا کیا جس سے تجھ پہ حرف آیا
وگرنہ یُوں تو ستم ہم پہ بے شمار ہوئے

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمنِ جاں تھے وہ غمگسار ہوئے

ہزار بار کیا ترکِ دوستی کا خیال
مگر فرازؔ پشیماں ہر ایک بار ہوئے

... اَن دیکھے دیاروں کے سفیر

اور جب ہو گا ترازو ہجر کے ترکش کا تیر
مختلف ہونگے تو کتنے دد مرے لوگوں سے ہم
جو چلے تھے کوچۂ جاناں سے مقتل کی طرف
بے نیازِ سنگِ خلقت بے غمِ تیغِ ستم
اپنے اپنے شوقِ بے پروا کی باراتیں لئے
دردِ وارفتہ کی شمعوں کو جلائے ہر قدم
ان میں ہر اک با وفا، ثابت قدم، زندہ ضمیر

ان کی آنکھیں ریزہ ریزہ ان کی جانیں زخم زخم
ان کے آنسو کانچ کے تابوت ریشم کے کفن
ان میں خوابیدہ کسی لیلیٰ کسی شیریں کا خواب
ان میں آسودہ جنونِ قیس و خونِ کوہکن
ان کے ماتھوں پر شکستوں کے نشاں ضربِ عدو
ان کے ہاتھوں کی لکیروں میں جوانمردوں کا فن
ان میں ہر اک تھا کسی دامِ تمنّا کا اسیر

ان پہ جو گذری وہ گذرے گی ہر اہلِ درد پر
اور ہم دونوں بھی اپنے جرم سے غافل نہیں
تیری پیشانی کی سج دھج میری چاہت کا غرور
گو یہ وہ زندہ ہیں جو شرمندۂ قاتل نہیں

پھر بھی کس دامن دریدہ کو یہاں بخشش ملی
اس سفر میں راستوں کے زخم ہیں منزل نہیں
اور ہم دونوں ہیں ان دیکھے دیاروں کے سفیر

اَب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سُوکھے ہوئے پھُول کتابوں میں ملیں

ڈھُونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دُنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر!
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

○

اچھا تھا اگر زخم نہ بھرتے کوئی دن اور
اس کوئے ملامت میں گزرتے کوئی دن اور

راتوں کو تری یادوں کے خورشید ابھرتے
آنکھوں میں ستارے سے اُترتے کوئی دن اور

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا
اے کاش ترے بعد گذرتے کوئی دِن اور

راحت تھی بہت رنج میں ہم غم طلبوں کو
تم اور بگڑتے تو سنورتے کوئی دن اور

گو ترکِ تعلق تھا مگر جاں پہ بنی تھی
مرتے جو تجھے یاد نہ کرتے کوئی دِن اور

اس شہرِ تمنّا سے فراز آتے ہی کیوں تھے
یہ حال اگر تھا تو ٹھہرتے کوئی دن اور

○

ترس رہا ہُوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو
کہ خود جدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو

وُہ کپکپاتے ہُوئے ہونٹ میرے شانے پر
وُہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا مجھ کو

چٹخ اٹھا ہوں سُلگتی چٹان کی صُورت
پکار اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو

تجھے تراش کے میں سخت منفعل ہوں کہ لوگ
تجھے صنم تو سمجھنے لگے خدا مجھ کو

یہ اور بات کہ اکثر دمک اٹھا چہرہ
کبھی کبھی یہی شعلہ بجھا گیا مجھ کو

یہ قربتیں ہی تو وجہِ فراق ٹھہری ہیں
بہت عزیز ہیں یارانِ بے وفا مجھ کو

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اسے فراز اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

○

کسی طرح تو بیاں حرفِ آرزو کرتے
جو لب سِلے تھے تو آنکھوں سے گفتگو کرتے

بس ایک نعرۂ مستاں دریدہ پیرہنو
کہاں کے طوق و سلاسل بس ایک ہُو کرتے

کبھی تو ہم سے بھی اے ساکنانِ شہرِ خیال
تھکے تھکے ہُوئے لہجے میں گفتگو کرتے

گلوں سے جسم تھے شاخِ صلیب پر لرزاں
تو کس نظر سے تماشائے رنگ و بُو کرتے

بہت دنوں سے ہے بے آب چشمِ خوں بستہ
وگرنہ ہم بھی چراغاں کنارِ جُو کرتے

یہ قربِ مرگِ وفا ہے اگر خبر ہوتی
تو ہم بھی تجھ سے بچھڑنے کی آرزُو کرتے

چمن پرست نہ ہوتے تو اے نسیمِ بہار
مثالِ برگِ خزاں تیری جستجُو کرتے

ہزار کوس پہ تُو اور یہ شام غربت کی
عجیب حال تھا پر کس سے گفتگو کرتے

فرازؔ مصرعۂ آتش پہ کیا غزل کہتے
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

مَیں اور تُو

روز جب دُھوپ پہاڑوں سے اُترنے لگتی
کوئی گھٹتا ہُوا بڑھتا ہُوا بیکل سایہ
ایک دیوار سے کہتا کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار
اپنے پندار کے نشے میں سدا استادہ
خواہشِ ہمدمِ دیرینہ پہ ہنس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی
کون دیوار ہمیشہ مگر استادہ رہی
وقت دیوار کا ساتھی ہے نہ سائے کا رفیق

اور اب سنگ و گل و خشت کے ملبے کے تلے
اسی دیوار کا پندار ہے ریزہ ریزہ
دھوپ نکلی ہے مگر جانے کہاں ہے سایہ

○

کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا
عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

دوست پرسش پہ مصر اور ہمارا شیوہ
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

ہم کو اس نام نے مارا کہ جہاں بھی جائیں
خلقتِ شہر نے طوفان اٹھائے رکھنا

اس چکا چوند میں آنکھیں بھی گنوا بیٹھو گے
اس کے ہوتے ہوئے پلکوں کو جھکائے رکھنا

افریشیائی ادیبوں کے نام

جہانِ لوح و قلم کے مسافرانِ جلیل
ہم اہلِ دشتِ پشاور سلام کہتے ہیں
دِلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مِٹتا ہے
یہ حرفِ شوق بصد احترام کہتے ہیں
ہزار لفظ و بیان و زباں کا فرق سہی
مگر حدیثِ وفا ہم تمام کہتے ہیں

وُہ ماؤ ہو کہ لوممبا، سکارنو ہو کہ فیض
سبھی کے لوح و قلم عظمتِ بشر کے نقیب
سب ایک درد کے رشتے میں منسلک بسمل
سبھی ہیں دُور نظر سے سبھی دلوں کے قریب
جکارتہ و سراندیپ سے پشاور تک
سبھی کا ایک ہی نعرہ سبھی کی ایک صلیب

ہمیں یہ سوچنا ہو گا کہ زندگی اپنی
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے
ہم اہلِ شرق ہیں سُورج تراشنے والے
مگر ہماری زمیں نور کو ترستی ہے
یہ کیا کہ جو بھی گھٹا دشت سے ہمارے اُٹھے
وُہ دُور پار سمندر پہ جا برستی ہے

زمیں سے اب نہیں اُترے گا کوئی پیغمبر
جہانِ آدم و حوا سنوارنے کے لئے
یہاں محمدؐ و گوتم، مسیح و کنفیوشس
جلا چکے ہیں بہت آگہی فروز دیئے
مگر ہے آج بھی اپنا نصیب تاریکی
مگر ہے آج بھی مشرق شبِ دراز لئے

ہمیں کو توڑنے ہونگے صنم قدامت کے
ہمیں کو اب نیا انسان ڈھالنا ہو گا
ہمیں کو اپنے قلم کی ستارہ سازی سے
ہر ایک خطۂ تیرہ اُجالنا ہو گا
ہمیں کو امن کے گیتوں سے میٹھے بولوں سے
مہیب جنگ کی آندھی کو ٹالنا ہو گا

میں کہ پُر شور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اَب کہ ڈُوبا ہُوں تو سُوکھے ہُوئے دریاؤں میں

نامُرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تو بھی شامل تھا کبھی میری تمنّاؤں میں

دِن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر!
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں